سید ریاض حسین شاہ

حقیقتِ تقویٰ
سید ریاض حسین شاہ
ادارہ تعلیماتِ اسلامیہ جہلم پاکستان

نام کتاب — حقیقت تقویٰ

مؤلف — سید ریاض حسین شاہ

کتابت — محمد باقر خوشنویس

بار ششم — اگست ۱۹۹۶ء

تعداد — ایک ہزار

قیمت — RS [illegible]

بنیادی عقیدہ

◎ اللہ ہمارا رب ہے، اور منزہ عن العیوب ہے۔

◎ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے رسول اور معصوم عن الخطا ہیں۔

◎ قرآن مجید خدا کی کتاب، ہمارا ضابطہ حیات اور بے عیب کلام ہے

انسان خطاؤں اور لغزشوں کا پتلا ہے۔ اس حیثیت سے بہرحال یہ امکان رہتا ہے کہ وہ لکھتے ہوئے پھسل جائے۔ دورانِ مطالعہ اگر آپ اشارۃً یا صراحۃً کسی بھی انداز میں ہمارے درج بالا بنیادی عقیدہ کو مجروح ہوتا ہوا پائیں، تو اسکو ہماری ذاتی کمزوری متصور کرتے ہوئے قلم زد کر دیجیے۔ ہم اپنی عزت مقام اور جھوٹی انا کے مقابلہ میں ایمان کو بہرصورت ترجیح دیتے ہیں۔

فہرست

باب اوّل

تقویٰ کا مفہوم اور معنی

باب دوم

تشکیلِ تقویٰ کی بنیادیں

نمبر	عنوانات	صفحہ

باب اوّل

تقویٰ کا معنی اور مفہوم

تقویٰ کیا ہے؟

تقویٰ انسانی زندگی کی وہ صفت ہے جو تمام انبیاء کی تعلیم کا نچوڑ رہی۔ اس کا لغوی معنی تو کسی شئے سے دور رہنے، اس سے بچنے یا اُسے چھوڑنے ہی کے ہوتے ہیں۔ لیکن شریعتِ اسلام میں تقویٰ نہایت وسیع معنی رکھتا ہے۔ مختصر طور پر تقویٰ کی تعریف کے سلسلہ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ دل کی اُس حالت کا نام ہے جس کی موجودگی میں انسان ہر اس فعل سے بچنے کی کوشش کرتا ہے جو اللہ پاک کو ناپسند ہو۔

"انما الاعمال بالنیات" کے تحت جس طرح نیّت ہر عمل کی جان ہوتی ہے اسی طرح تقویٰ میں بھی اسے بڑا دخل ہے۔ اگر ارتکابِ گناہ اور خدا کی نافرمانی سے صرف اس لئے بچا جائے کہ خدا ناراض ہوگا یا رحمتِ الٰہی سے محرومی ہوگی تو تقویٰ کی حقیقت حاصل ہوتی ہے ورنہ اگر خیال رسوائی یا بدنامی کا ڈر ہو یا کوئی عمل دکھلاوے کے لئے کیا جائے تو تقویٰ نہیں ہوگا۔

قرآن و حدیث میں لفظ "تقویٰ" مختلف صورتوں میں بے شمار مقامات پر استعمال کیا گیا ہے۔ مختلف استعمالات کے پیشِ نظر اس کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے:۔

"تقویٰ رذائل سے بچنے اور فضائل سے آراستہ ہونے کا نام ہے۔"

نصرآبادی فرمایا کرتے تھے کہ تقویٰ یہ ہے کہ انسان اللہ کے سوا ہر چیز سے بچے ——— طلق ابن حبیب کا قول ہے کہ

"اللہ کے عذاب سے ڈر کر اس کے نور کے مطابق اطاعت خداوندی یعنی اس کے احکام پر عمل کرنے کا نام تقویٰ ہے۔"

(رسالہ قشیریہ)

حضرت جمشید نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ:-

"زندگی اطاعتِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں گذارنا تقویٰ ہے۔"

"حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت کعب الاحبار رضی اللہ عنہ سے تقویٰ کی تعریف پوچھی تو حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے سوال کیا "کیا آپ کبھی خار دار راستہ پر چلے ہیں؟" آپ نے جواب دیا "ہاں"۔ پھر پوچھا کہ "آپ نے کیا طریقہ استعمال کیا؟" حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمانے لگے "میں کانٹوں سے بچ بچ کر اور کپڑوں کو سمیٹ کر چلا" حضرت کعب رضی اللہ عنہ بولے "یہی "تقویٰ" ہے"۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی مثال خار دار راستے کی ہے۔ مومن کا کام یہ ہے کہ اس میں سے گزرتے ہوئے دامن سمیٹ کر چلے۔ اس کی کامیابی اسی میں ہے کہ ہر کام میں دیکھے کہ اس میں خدا کی خوشنودی مضمر ہے یا نہیں۔

ابو عبداللہ رودباری فرمایا کرتے تھے کہ "تقویٰ یہ ہے کہ ان تمام چیزوں سے اجتناب کیا جائے جو اللہ سے دُور رکھنے والی ہوں۔"

حضرت واسطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ——— "اپنے تقویٰ سے

پہنچنے کا نام تقویٰ ہے۔"

متقی آدمی کے لئے ضروری ہے کہ وہ ریا سے بچے اس لئے کہ یہ اعمال کو اس طرح کھاتی ہے جس طرح دیمک لکڑی کو کھا جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت ذوالنون مصری علیہ الرحمتہ کے علاقہ میں ایک بار قحط پڑ گیا۔ لوگ آپ کے پاس دُعا کروانے کے لئے آئے۔ آپ فرمانے لگے "بارش اِس لئے نہیں ہوتی کہ گناہ گار زیادہ ہو گئے ہیں اور سب سے بڑا گناہ گار میں ہوں۔ اگر مجھے شہر سے نکال دیا جائے تو بارانِ رحمت برسنے لگ جائے گی۔

اللہ اُن لوگوں پر رحمتیں برسائے عظیم ہوتے ہوئے بھی اُن کے ہاں دعویٰ نہیں تھا اور اسی کا نام تقویٰ ہے۔

فروتنی است دلیلِ رسیدگانِ کمال
کہ چوں سوار بمنزل رسد پیادہ شود

یعنی اہلِ کمال کی نشانی عاجزی اور انکساری ہوتی ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ سوار جب منزلِ مقصود پر پہنچتا ہے تو پیادہ ہو جاتا ہے۔

تقویٰ کے مدارج

پہلا درجہ

التوقی عن العذاب المخلد بالتبری عن الشرك۔

(انوار التنزیل جلد اوّل صلہ)

عذابِ آخرت سے ڈر کر اپنے آپ کو شرک سے بچانا تقویٰ ہے۔

اللہ تعالیٰ کو اُس کی ذات، صفات اور افعال میں یکتا جاننا تقویٰ کا پہلا زینہ

ہے۔ مومن کے عرفانی مدارج کا کمال یہ ہوتا ہے کہ اُس کی رگ و جان میں توحید رچی بسی ہوتی ہے۔ وہ اللہ ہی کو معبود سمجھتا ہے، اور اُسی ذات کو مقصود تصوّر کرتا ہے۔

گو یہ سب کو تسلیم ہے کہ معبود وہی ہے
مگر کم ہیں جو سمجھتے ہیں کہ مقصود وہی ہے

متّقی شرک کو ظلم عظیم سمجھتا ہے۔ اس کی دعوت و تبلیغ کا محور اثباتِ توحید اور تردیدِ شرک ہوتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ توہین انبیاء اور گستاخیٔ اولیاء توحید نہیں بلکہ جرمِ عظیم ہے۔ جس طرح خدا کی ذات و صفات میں کسی کو شریک ٹھہرانا کفر ہے، اسی طرح انبیاء و مرسلین کو اپنی طرح سمجھنا یا اپنے آپ کو اُن کے مثل جاننا صریح کفر ہے۔ اللہ پاک ہر قسم کے شرک سے بچائے۔ آمین یارب العالمین۔

عقائد کا ٹھیک ہونا تقویٰ کی جان ہے۔ سورہ بقرہ میں متّقی کی تعریف میں اس کے اعمال کے ساتھ ساتھ راسخ عقائد ہی کا ذکر کیا گیا ہے۔

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ہ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ ج وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ ہ

(القرآن - ۲:۲ تا ۶)

"وہ لوگ جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں، اور ہمارے دیئے ہوئے سے خرچ کرتے ہیں جو آپ پر اور آپ سے پہلے نازل ہونے والی وحی پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔"

دوسرا درجہ

التجنب عن كل ما يؤثم من ادرك حتى الصغائر۔
(انوار التنزیل جلد اول ص۱۶)

"ہر وہ فعل جس میں گناہ کا اندیشہ ہو یہاں تک کہ صغیرہ گناہوں سے بچنا بھی تقویٰ کہلاتا ہے"۔

تقویٰ کے اس مرتبہ کی طرف قرآن حکیم نے اس طرح اشارہ فرمایا ہے:۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا۔
(الاعراف۔ ۹۶)

"کاش بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے"۔

متقی کے لئے ان حدود کا لحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے جو کائنات کے خالق نے متعین کی ہیں۔ یہ سب کچھ اسی صورت میں ممکن ہوتا ہے جب خوف الٰہی دل میں پوری طرح جاگزیں ہو اور انسان ہر وقت یہ سوچے کہ یہ دنیا اندھیر نگری نہیں، بلکہ امتحان گاہ ہے اور ایک نہ ایک دن اسے ضرور اپنے اعمال کے بارے میں جواب دہ ہونا ہے۔

تیسرا درجہ

علامہ ناصر الدین ابو سعید عبداللہ بن عمر بیضاوی لکھتے ہیں:۔

والثالثة ان يتنزه عما يشغل سره عن الحق ويتبتل اليه بشراشره وهو التقوى الحقيقي المطلوب۔
(انوار التنزیل ص۱۶ جلد اوّل)

"ہر وقت اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم رکھنا اور اس سے غافل کر دینے والی اشیاء سے لاتعلق ہونا تقویٰ ہے اور تقویٰ کی یہی حالت حقیقی اور مطلوب و مقصود ہے"۔

یہاں تعلق سے مراد ہر وقت خدا کو یاد کرنا ہے۔ ہر فعل میں اس کی رضا دیکھنا ہے۔ بعض صوفیاء کا "پاس انفاس" کا معمول بھی تقویٰ کے اس مفہوم میں آ سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں تقویٰ کی اس حالت کو "ما سوی اللہ بس" سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یعنی اللہ کے سوا ہر چیز سے بے نیاز ہو جانا۔

قرآنِ مجید میں پروردگارِ عالم ارشاد فرماتے ہیں :-

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ ط

(آلِ عمران : ۱۰۲)

"اے ایمان والو تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ تقویٰ کا حق ہے"۔

انسان کو ہر وقت اِس کوشش میں لگے رہنا چاہیئے کہ کوئی چیز راہِ دین سے غفلت کا سبب نہ بنے۔ شیطانی طاقتیں اس پر غالب نہ آئیں۔ نفس امارہ اُسے اپنے دامن میں نہ لے، اور یہ سب کچھ عمل پیہم اور جہادِ مسلسل سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ فکر اور جذبۂ صادق اس سلسلہ میں ممد اور معاون ثابت ہوتے ہیں۔

تقویٰ کی اہمیت

متقیانہ زندگی انسان کو نمونے کا انسان بنا دیتی ہے۔ مسلمان صرف اجتماعی زندگی میں ایک ضابطے کا پابند نہیں بلکہ وہ انفرادی زندگی میں بھی ایک دستور اور قانون کے مطابق تعمیر اور تطہیرِ حیات کی منازل طے کرتا ہے۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، قول و فعل رضائے الٰہی کے حصول کے لئے ہوتے ہیں۔

تقویٰ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بار پوچھا گیا "آلِ نبی کون لوگ ہیں"؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا: "متقی"۔

علاوہ ازیں اسلام کا سارا نظامِ عبادت یہی مقصد رکھتا ہے کہ لوگ "متقی" یعنی صاحبِ کردار بن جائیں۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اوقات "تقویٰ" کے لئے دعا فرماتے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الْهُدٰی وَالتُّقٰی وَالْعَفَافَ وَالْغِنٰی۔

"اے اللہ! میں تجھ سے ہدایت، تقویٰ اور عفت و غنا کا سوال کرتا ہوں۔"

تقویٰ کی حد

انبیاء کرام معصوم ہستیاں ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کی تخلیق ہی ایسے کرتا ہے کہ وہ بشری کمزوریوں سے پاک ہوتے ہیں۔ "تقویٰ" اگر پوری آب و تاب کے ساتھ کہیں دکھائی دے سکتا ہے تو وہ انبیاء ہی ہیں۔ اس کے علاوہ کسی شخص کی زندگی میں "تقویٰ" اس کاملیت کے ساتھ جو ان کے ہاں ہوتا ہے نہیں پایا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے اس کی کوئی آخری حد مقرر نہیں کی، بلکہ ارشاد فرمایا:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ۔ (التغابن۔ ۱۶)

پس ڈرو اللہ سے اپنی بساط کے مطابق۔

یعنی تقویٰ کا حق ادا کرنے میں تم کوئی کسر نہ اُٹھا رکھو بلکہ ہر شخص اپنی طاقت کے مطابق یہ کوشش کرے کہ اس کی زندگی احکامِ الٰہی کے مطابق بسر ہو۔

تقویٰ کے اثرات

اسلامی کردار یعنی تقویٰ کے اختیار کرنے سے ایک مسلمان کی زندگی پر بے شمار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ دینی اور دنیوی زندگی میں اس کی بدولت انسانی ضمیر کو سکون وچین میسّر ہوتا ہے۔

قرآن کی روشنی میں تقویٰ کے اثرات پر ہم ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں۔

تقویٰ اور انسانی عظمت کا راز

عظمت اور بزرگی کی تلاش انسانی فطرت ہے۔ ہر شخص معاشرہ میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسلام کی نظر میں عظمت و شرافت اور بلندیٔ مراتب کا معیار دولت کی کثرت نہیں۔ مال و زر کا ہونا نہیں اور نہ ہی حسن و جمال کو اس میں کوئی دخل ہے بلکہ اپنی زندگی کو اللہ کی رضا کی خاطر گذارنا فضیلت کی اصل کسوٹی ہے۔

قرآن مجید اس بات کی تائید یوں کرتا ہے:۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ (الحجرات۔۱۳)

اللہ کے نزدیک معزز ترین شخص وہ ہے جو تم میں زیادہ پرہیز گار ہے۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک قول سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ حقیقی شرف تقویٰ ہی میں ہے۔ آپ نے قبا کے خطبہ میں ایک بار ارشاد فرمایا: "تقویٰ عزت دلاتا ہے اور اللہ کو خوش کرتا ہے"۔

معلوم ہوا کہ حسب ونسب کی روحانی اور مقصودی زندگی میں کوئی اہمیّت نہیں بلکہ یہ وہ بت ہیں جن کی پوجا سے ہماری قوم مسلم قومیّت کھوتی جا رہی ہے۔ نسلی اور معاشی امتیازات نے ہمارے اسلامی معاشرہ کو اندر سے کھوکھلا کر دیا ہے۔ علاقائی تعصبات دل و دماغ پر پوری طرح تسلط جمارہے ہیں اور یہ سب کچھ تقویٰ کے منافی ہے۔

تقویٰ اور فلاحِ حقیقی

انسان جب تک نظامِ وحی سے رہنمائی حاصل نہیں کرتا نقصان اور خسارے میں رہتا ہے۔ ہدایت کے لیئے وجدان اور عقل اس کے لئے ناکافی ثابت ہوتے ہیں۔ اگر وہ اپنے خالق اور ہادی کی طرف رجوع نہ کرے تو وہ اکثر فیصلے غلط کرتا ہے۔ اس کی دماغی اور ذہنی قوتیں زندگی کی پُرپیچ راہوں میں اُس کی ساتھی نہیں بنتیں۔ وہ یہاں پہنچ کر بے لبس ہو جاتا ہے۔ اس کی نگاہیں کسی ہادی کو تلاش کرتی ہیں۔ اگر اس بیچارگی کے عالم میں وہ فطرت کی آواز سُن کر اپنے خالق و مالک کے "نظامِ ہدایت" جو مختلف ادوار میں انبیاء کی وساطت سے انسانیت کی رہنمائی کرتا رہا کو پہچان لے تو فطرت اُسے فلاح کا پیغام دیتی ہے۔
وہ لوگ جن کے سینے ایمان سے خالی ہیں اور ان کے اعمال قرآن وسنت کے برعکس ہیں بے شک وہ انسان تو ہیں لیکن "نظامِ وحی" سے عدمِ تمسّک کی بناء پر نقصان وخُسران ان کا مقدّر ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۔ (العصر۔ ۲)

"بے شک انسان خسارے میں ہے۔"
نقصان کے مقابلہ میں قرآن "فلاح" کی اصطلاح استعمال کرتا ہے، اور

"فلاح" کی شرائط میں تقویٰ کو ایک خاص اہمیّت حاصل ہے۔
سورۃ "البقرہ" میں متقی کی چھ صفات بیان کرنے کے بعد ربّ ذوالجلال ارشاد فرماتے ہیں:۔

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (البقرہ - ۵)

"یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ کامیاب و کامران ہیں"

تقویٰ اور سکون زندگی

کون نہیں جانتا کہ ہماری زندگی میں جتنی بھی مشکلات ہیں "قرآن" سے بغاوت ہی کا نتیجہ ہیں۔ اگر ہم اپنے آپ کو تربیّت کے لئے قرآنی سانچوں میں ڈھالتے ہیں اس کا مطلوبہ کردار جس کو وہ "تقویٰ" کا نام دیتا ہے اپنے اندر پیدا کر لیتے تو یقیناً ہماری زندگی میں اس قدر بے چینیاں نہ ہوتیں بلکہ سکون و آرام سے دن گزارتے۔

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا۔
اور جو اللہ سے ڈرے وہ اس کے کام میں آسانی فرما دے گا۔

تقویٰ اور قرب الٰہی

قرآن مجید میں ارشاد ربّ العزّت ہے:۔
اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (الانفال: ۳۴)

"بلاشبہ متقی ہی اللہ کے دوست ہوتے ہیں لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔

اگر صحیح معنوں میں پرہیزگاری ہمارا شعار بن جائے۔ خدا کا خوف ہمارے دلوں میں راسخ ہو جائے تو "نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ" (ہم شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں) کی نوید جانفزا آج بھی قرآن مجید سنا رہا ہے۔ متقی ہی کے بارے میں رب ذوالجلال ارشاد فرماتے ہیں:۔

اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ٥ (التوبہ: ۷)

بے شک اللہ پاک متقی لوگوں ہی سے محبت کرتا ہے۔

انوارِ الٰہیہ کے مشتاق کے لئے اس سے بڑا انعام کیا ہو سکتا ہے کہ محبوب و مطلوب اپنی توجہ و التفات کے جیتنے کا نسخہ خود تجویز فرما رہا ہے۔ کیا یہی وہ مقام نہیں جس کی خاطر بدر و حنین کے معرکے وجود میں آئے۔ کربلا میں اہلِ بیت اطہار کا خون گرا۔ باپ نے بیٹے کی گردن پر چھری رکھی۔

اے بندگانِ خدا! اگر تم بھی چاہتے ہو کہ محبتِ الٰہی کی سوغات تمہارے حصے میں بھی آئے تو اپنے آپ میں متقی لوگوں کی صفات پیدا کیجئے۔

تقویٰ اور امتیاز

تقویٰ کے اجتماعی اثرات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ معاشرہ جو "من حیث الجماعت" (پوری جماعت کی حیثیت سے) اپنے آپ کو کتاب و سنت کے مطابق بنا لیتا ہے۔ اقوامِ عالم میں اس کی شان نرالی اور امتیازی بن جاتی ہے۔

ارشادِ رب العزت ہے:۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ

لَّكُمْ فُرْقَانًا۔ (الانفال : ۲۹)

"اُے اہلِ ایمان! اگر تم اللہ سے ڈرو گے تو وہ تمہارے لئے امتیاز قائم کر دے گا۔"

"امتیاز" کی مختلف نوعیتیں ہو سکتی ہیں۔ یعنی اِس سے ایک معنی تو یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ تم میں اچھی اور بُری چیز میں امتیاز کرنے کی قوّت پیدا فرما دے گا یعنی بصیرت عطا کر دے گا، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اقوام میں تمہیں امتیازی شان عطا کر دے۔

تقویٰ اور کشادگیِ رزق

روٹی، کپڑے اور مکان کا مسئلہ ہر دَور میں بڑی اہمیّت کا حامل ہوتا ہے۔ قرآن نے معاشی آسودگی بھی اپنی حدود میں قائم رہنے ہی میں قرار دی۔ ارشادِ ربّ العزّت ہے:

"وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ۔" (الطلاق: ۲-۳)

"متّقی کے لئے اللہ تنگی سے نکلنے کے سامان مہیّا کرتا ہے، اور اُسے وہاں سے روزی دیتا ہے کہ اس کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا ہے۔"

اِسلامی نظام کا مکمل مطالعہ کرنے سے اچھی طرح اس نتیجہ پر پہنچا جا سکتا ہے کہ اسلام کیسے "معاشی خوشحالی" دیتا ہے۔

اِس کے برعکس "اعراض عن القرآن" سے اقوام و ملّل کی معاش و معیشت تنگ کر کے رکھ دی جاتی ہے۔ قرآن نے معاشی تنگی کی وجہ ہی اِس

نظام سے بغاوت کو قرار دیا ہے۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَعْمٰى۔

(طٰہٰ : ۱۲۴)

"جس نے ہماری یاد سے غفلت برتی بے شک معیشت تنگ ہو جائے گی اور ہم اُسے قیامت کے دن اندھا اٹھائیں گے۔"

باب دوم

تشکیل تقویٰ کی بنیادیں

مضبوط ایمان

ایمان کی مضبوطی اور استحکام تعمیرِ سیرت میں ہر روز نئی آن اور نئی شان پیدا کرتے ہیں۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قربِ الٰہی اور اتقاء لازم وملزوم ہیں تو پھر یہ سمجھنے میں دشواری نہیں ہوگی کہ قربِ خداوندی کا پہلا زینہ ہی استحکام ایمان ہے۔ ایمان جتنا مضبوط ہوگا کردار اتنا ہی اعلیٰ ہوگا۔ ایمان کی کمزوری سیرت و کردار کو کمزور کرتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جب بھی مردِ مومن کو کسی عمل اور جہاد کے لئے تیار ہونے کی دعوت دی "ایمان" کا ذکر ضرور کیا۔ وہ تجارتِ عظیم جس کو "عذابٌ الیمٌ" (دردناک عذاب) سے چھٹکارے کا باعث قرار دیا گیا۔ اس میں بھی سب سے پہلے ایمان باللہ اور ایمان بالرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ہی ذکر کیا گیا۔

تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ۔ (الصف : ۱۱)

"اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ اور خدا کے راستے میں اپنے مال اور جان کے ساتھ جہاد کرو۔"

کردار کی تعمیر

"تقویٰ" کا ترجمہ اگر عام فہم الفاظ میں کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ تقویٰ "اسلامی کردار" کا دوسرا نام ہے۔ یاد رہے کہ تعمیر کردار کے لئے قرآن کثرت عبادت کا ایک نسخہ بھی تجویز کرتا ہے۔ مثلاً بے حیائی سے رکنے کے لئے یا صبر کی صفت پیدا کرنے کے لئے نماز کا پڑھنا تجویز کیا گیا۔

انسانی طبائع میں رچ بس جانے والی مذموم حرکتیں کثرتِ زہد ہی سے عاداتِ حسنہ سے بدلتی ہیں۔

پروردگارِ عالمین ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں:۔

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

(البقرہ : ۲۰)

"اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا فرمایا، تاکہ تم متقی بن جاؤ۔"

رمضان المبارک کے روزوں کا فلسفہ بھی یہی بیان فرمایا:۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

(البقرہ : ۱۸۳)

"اے اہلِ ایمان! تم پر پہلے لوگوں کی طرح روزے فرض کر دیئے گئے تاکہ تم متقی بن جاؤ۔"

تلاشِ مرشد

ایمان کی حرارت، محبت کی گرمی اور عشق کی تپش شیخ کامل کی وجہ ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ قرآن حکیم بھی تعمیر سیرت، پختگی کردار، تشکیل تقویٰ اور آنکھوں سے غفلت کی پٹیاں دور کرنے کے لئے "وسیلہ" ضروری قرار دیتا ہے۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ (المائدہ : ۳۵)

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس تک پہنچنے کا وسیلہ تلاش کرو اور اس کی راہ میں جہاد کرو تاکہ تمہاری فلاح ہو۔"

آیت میں وسیلہ سے مراد جہاں کتاب و سنت ہے وہاں پیر و مرشد کی توجہ اس کی تلاش اور بیعت ہے شاہ ولی اللہ اور مولوی اسماعیل دہلوی نے اس سے یہی مراد لی ہے۔
(قول جمیل، صراطِ مستقیم بحوالہ ضیاء القرآن)

ڈاکٹر علامہ اقبال علیہ الرحمۃ شیخ کامل کی توجہ کے اثرات ایک جگہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

دمِ عارف نسیم صبح دم ہے
اسی سے ریشۂ معنیٰ میں نم ہے
اگر کوئی شعیب آئے میسر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

غور و فکر

تقویٰ اسلام کی روح ہے اور اسلام دینِ فطرت ہے۔ اس کی حقانیت

لامحالہ ہر اُس ذہن کو تسلیم کرنی پڑتی ہے جو تعصّب کی پٹی اتار کر صحیح خطوط پر غور و فکر کرے۔ قرآن جو ایک الہامی کتاب ہے وہ صرف اپنے قاری کو تلاوت ہی کی دعوت نہیں دیتی بلکہ فکر اور تدبّر کرنے کی تعلیم بھی دیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غور و فکر سے انسانی ضمیر زندہ ہوتا ہے اور حقائق کو تسلیم کرنا سیکھتا ہے جب قلب و جگر اور دل و دماغ کسی بات کو تسلیم کر لیتے ہیں تو اُن کے تقاضے پورے کرنے پھر مشکل نہیں رہتے۔

تقویٰ چونکہ اسلام کا تقاضا ہے، اس لئے اس کی تشکیل بھی غور و فکر کی مرہونِ منت ہے۔

قرآن کی دعوتِ فکر کو تین حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

۱۔ کتاب
۲۔ انفس
۳۔ آفاق

قرآن سے استدلال

۱۔ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ؕ

(بنی اسرائیل : ۴۱)

"بلا شبہ ہم نے قرآن میں طرح طرح سے سمجھایا تاکہ نصیحت حاصل کریں"

۲۔ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ۝ يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

لَاٰیَۃً لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ؁ (النحل : ۱۰، ۱۱)

"وہ ذات جس نے تمہارے لئے آسمان سے پینے کے لئے پانی اتارا تم اُس سے (اُگنے والے) درختوں سے چراتے بھی ہو (وہ ذات) جو تمہارے لیے اس سے کھیتی اگاتا ہے۔ زیتون، کھجور، انگور اور ہر قسم کے پھل۔ بلاشک اس میں فکر کرنے والی قوم کے لئے نشانی ہے۔"

۳۔ قُلْ مَنْ یَّرْزُقُکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ یَّمْلِکُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ یُّخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَیُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَمَنْ یُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ط فَسَیَقُوْلُوْنَ اللّٰہُ ج فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ؁ (یونس : ۳۱)

"ان سے پوچھو تمہیں زمین اور آسمان سے رزق کون دیتا ہے، سماعت اور بصارت کی قوتوں کا مالک کون ہے۔ بے جان سے جاندار کو اور جاندار سے بے جان کو کون نکالتا ہے۔ اِس نظامِ کائنات کی تدبیر کون کر رہا ہے۔ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ۔ پس کہو تم کیوں تقویٰ اختیار نہیں کرتے۔"

۴۔ سورت غاشیہ میں ایک مقام پر غور و فکر کی دعوت اس انداز میں دی گئی

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ ؁ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ ؁ وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ ؁ وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ ؁

(الغاشیہ : ۱۷ تا ۲۰)

"کیا وہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کیونکر پیدا ہوئے اور آسمان کو کہ کیسے بلند کیا گیا۔ پہاڑوں کی طرف کہ کس طرح گاڑے گئے ہیں اور زمین کو کہ کس طرح بچھائی گئی ہے۔"

علمِ شریعت کا ہونا

تقویٰ کا تعلق چونکہ شریعت سے ہے۔ اس لئے ہر متقی اور پرہیزگار شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ شریعت کا مکمل علم رکھتا ہو یا اگر زیادہ نہیں تو کم از کم جائز و ناجائز اور حلال و حرام کا علم رکھنا از حد ضروری ہے۔

تقویٰ کا بلند ترین مقام عرفان رب ہے جسے فقر سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے حضرت باہو علیہ الرحمتہ اس کے بارے میں فرماتے ہیں۔ ؏

علموں باہج جو کرے فقیری ٭ کافر مرے دیوانہ ہو

خداوند کریم امتِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہزار ہا اُن فریب کاروں سے بچائے جو طریقت کو شریعت سے الگ کر کے لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے۔ ؏

اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبیت

اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ جو بھی طریقہ ہے خواہ وہ کتنا ہی دلکش کیوں نہ ہو نفس کی کرشمہ سازی کے سوا کچھ نہیں۔

خوفِ خدا

"تقویٰ" پیدا کرنے کے لئے خوفِ خدا کا ہونا بھی اشد ضروری ہے لیکن خوف کو اتنا نہ بڑھایا جائے کہ امید ختم ہی ہو کر رہ جائے۔ ایک حدیث کے

مطابق ایمان خوف اور امید کے درمیان ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ایک مشہور قول ہے کہ:۔

"اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اعلان کیا جائے کہ جنّت میں صرف ایک ہی شخص داخل کیا جائے گا تو میں کہوں گا کہ وہ شخص میں ہی ہوں لیکن اگر یہ اعلان ہو جائے کہ دوزخ میں صرف ایک ہی آدمی داخل ہوگا تو مجھے اندیشہ ہوگا کہ وہ آدمی کہیں میں ہی نہ ہوں۔"

خوفِ خدا کے لئے آخرت، موت اور قبر کا فکر ضروری ہے۔ ایک شخص کو مَیں نے دیکھا کہ مُرغ ذبح کرتے ہوئے رو رہا تھا اور ساتھ ہی یہ کہہ رہا تھا کہ بے زبان اور غیر مکلّف چیز مرتے ہوئے اگر اتنی تکلیف میں مبتلا ہے تو گناہ گار انسانوں کا کیا حال ہوگا۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ایک روایت ہے کہ جب آسمان پہ بادل چھا جاتے تو آپ کا چہرہ متغیّر ہو جاتا اور آپ خوفِ خدا سے کبھی گھر سے باہر آتے اور کبھی اندر جاتے۔ جب بارش ختم ہو جاتی تو آپ مسرور ہو جاتے۔

فطرتِ انسانی میں یہ بات داخل ہے جب اُسے کسی بات کا خوف ہو تو عمل کی قوّت اس میں تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے۔ البتہ خوف کی نوعیتیں بدلتی رہتی ہیں۔

اسلام بھی اپنے ماننے والوں کو ایک غائب ہستی کی باز پرس سے ڈرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اِس خوف کا اثر یہ ہے کہ کسی پولیس یا محتسب کی غیر موجودگی میں بھی انسان ایسا کام کرنے سے رُک جاتا ہے جس سے اس کے ربّ کی نافرمانی ہوتی ہو اور خلقِ خدا کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہو۔

خوفِ آخرت

ایک حدیث میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :۔
" اللہ تعالیٰ کو اُن آنسوؤں سے پیار ہے جو خوفِ الٰہی سے جاری ہوتے ہیں۔" (مشکوٰۃ شریف باب الجہاد)

ایک بزرگ نے ایک روتے ہوئے لڑکے سے رونے کا سبب دریافت کیا تو اُس نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈر کر رو رہا ہوں ۔ انہوں نے پوچھا خوف کا سبب کیا ہے ؟ تو اُس نے کہا کہ کتابِ حکیم میں ارشادِ ربّ العزّت ہے :۔

فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ

(البقرہ : ۲۴)

ڈرو اُس آگ سے جس کا ایندھن (گناہگار) لوگ اور پتھر ہیں۔"

میں سوچتا ہوں کہ جب میری ماں آگ جلاتی ہے تو چولہے میں بڑی لکڑیوں کو آگ لگانے کے لئے نیچے چھوٹی چھوٹی لکڑیاں رکھتی ہے تاکہ آسانی سے آگ روشن ہو جائے ۔ اگر خداوند کریم نے بھی جہنّم میں بڑے بڑے نافرمانوں کو آگ میں ڈالا تو مجھ جیسے چھوٹے چھوٹے گناہگاروں کو بھی کہیں آگ میں نہ ڈال دیا جائے۔

مولانا رُومی کا ایک شعر ہے ۔

ہر کجا آبِ رواں غنچہ بود
ہر کجا اشکِ رواں رحمت بود

جہاں پانی چلتا ہے وہاں باغات ہوتے ہیں اور جہاں آنسو جاری ہوں وہاں خدا کی رحمت ہوتی ہے ۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ خوفِ الٰہی سے رو یا کرو

اگر رونا نہ آئے تو رونے والی شکل ہی بنا لیا کرو۔

خوفِ خدا کے بارے میں قرآنِ حکیم میں ربِّ ذوالکمال ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں :۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰىۙ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰىؕ

(النّٰزعٰت : ۴۰، ۴۱)

اور جس نے اپنے ربّ کے سامنے حاضری کا خوف رکھا اور اپنے آپ کو خواہشات سے باز رکھا۔ بے شک اس کا ٹھکانہ جنت ہے۔"

دُعا

اسلامی اور روحانی زندگی میں طلب اور جستجو کا ایک خاص مقام ہے۔ ہدایت اور گمراہی ہر دو منجانب اللہ ہی ہوتے ہیں۔ مردِ مومن کو چاہیئے کہ وہ ہر وقت خدا کی چوکھٹ پر پڑا رہے۔ اُس سے سوال کرتا رہے۔ اُسی داتا کی عطا سے زنگ آلود دل پاک ہوتے ہیں۔ مخلوق کو خالق کا قربِ مقصود حاصل ہوتا ہے۔

یہ بات مسلمہ ہے کہ عبادت سے "تقویٰ" کی تشکیل ہوتی ہے اور دعا کے بارے میں رؤف رحیم آقا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :۔

اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ ۔ (رواہ ابوداؤد)

دُعا ہی عبادت ہے۔

ایک حدیث کا مضمون یہ بھی ہے کہ

"دُعا عبادت کا مغز ہے۔"

"آقا کے اِن دو اقوال سے پتہ چلا کہ دعا میں اگر عجز و نیاز مندی شامل ہو، اور دعا گو ریا و نمود سے اجتناب کر کے ربّ ذو الجلال کو پکارے تو اس کی تاثیر عبادتِ عامہ سے زیادہ ہوتی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ تشکیل تقویٰ کے لئے صدقِ طلب کا ہونا ضروری ہے۔ رشد و ہدایت کے نور کے حصول کے لئے خود بھی دعا کرنی چاہیئے اور اللہ کے نیک بندوں سے بھی دعا کروانی چاہیئے اس لئے کہ یہ حقیقت ہے کہ ؎

نگاہِ ولی میں یہ تاثیر دیکھی
بدلتی ہزاروں کی تقدیر دیکھی

استقامت

استقامت سے مراد لزومِ طاعت ہے۔ بعض علماء نے کہا کہ خداوند تعالیٰ کی رضا کے مطابق اپنے سارے امور کا نظام درست رکھنا استقامت کہلاتا ہے۔ ایمان کے بعد استقامت کی اہمیت کا اندازہ مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ایک بار آپ سے یہ پوچھا گیا کہ کوئی ایسا عمل بتائیں کہ کسی اور سے پوچھنے کی حاجت نہ رہے۔ آقا و مولا نے ارشاد فرمایا:۔

قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ۔

کہہ کہ میں ایمان لایا اللہ پر۔ پھر استقامت اختیار کر۔

صوفیاء کا مسلک ہے کہ استقامت اور استقلال کرامت سے بھی زیادہ اہم شئے ہے۔ اہلِ ایمان کے اسی وصف کو قرآن مجید نے ایک مقام پر یوں بیان فرمایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ (الاحقاف:۱۳)

"بے شک جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پہ
ثابت قدم رہے۔ نہ ان پہ خوف نہ ان کو غم۔

(الاحقاف : ۱۳)

استقامت کا آسان تر مفہوم ثابت قدمی کا ہے۔ تقویٰ کا تعلق چونکہ
اجتناب معاصی اور حلیت اوامر سے ہے۔ اس لئے حصولِ علم کے بعد تقویٰ کے
ثمرات دیکھنے کے لئے صبر اور ثبات کا ہونا اشد ضروری ہے۔

بابِ سوم

تقویٰ کے تقاضے

شرک سے اجتناب

تقویٰ کا اوّلین تقاضا یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانے سے اجتناب کیا جائے۔ کیونکہ انبیاء کا پہلا درس ہی توحید کا اثبات اور شرک کی نفی ہے۔

شرک کے بارے میں قرآنی رویّے کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:-

۱۔ شرک ناقابلِ معافی جرم ہے۔ (النساء : ۴۸)

۱۔ شرک کرنے سے پہلے کے تمام اعمال ختم ہو جاتے ہیں۔ (الانعام : ۸۹)

۳۔ شرک سے آدمی بزدل ہوتا ہے اور مشرک کا انجام جہنم ہے۔ (آلِ عمران : ۱۵۱)

۴۔ شرک جہالت ہے۔ (الاعراف : ۱۳۸)

۵۔ شرک ظلمِ عظیم ہے۔ (لقمان : ۱۳)

۶۔ مشرک خواہشاتِ نفس کے غلام ہوتے ہیں۔ (النجم : ۲۳)

۷۔ بدترین مخلوق مشرک ہے۔ (البیّنہ : ۶)

نظامِ عبادات کا قیام

اصلاحِ عقائد کے بعد عملی زندگی کے میدان میں جس چیز کی اوّلین ضرورت

ہے۔ وہ نظامِ عبادت کا قیام ہے۔ تقویٰ کے تقاضوں کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ تخلیق انسانیت کی علت معلوم کی جائے اور وہ یہ ہے کہ :۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ٥

(الذاریت : ۵۶)

"ہم نے جنوں اور انسانوں کو نہیں پیدا کیا مگر عبادت کے لئے۔"

عبادت کا مفہوم نہایت وسیع ہے۔ اس میں ہر وہ چیز آجاتی ہے جس کے کرنے اور باز آجانے سے رضائے ربّ کا پروانہ ملتا ہو لیکن نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج اسلامی نظامِ عبادت کی بنیادیں ہیں۔ ان میں سے بھی نماز کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ روزِ محشر اوّلین پرسش اسی کے بارے میں ہوگی۔ ؎

روزِ محشر کہ جاں گداز بود
اوّلین پرسشِ نماز بود

ذکرِ الٰہی میں مشغولیت

اللہ کا ذکر دلوں کو صاف کرتا ہے۔ بداعمالیوں اور بدعقیدگیوں سے نجات دلاتا ہے۔ بے حیائی اور فحاشی سے منع کرتا ہے۔ انسانی کردار کو نکھارتا ہے۔ مزاج میں اعتدال پیدا کرتا ہے۔ سیرت میں حسن لاتا ہے۔ طبیعت کو استغنا بخشتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کثرتِ ذکر سے انسان قربِ الٰہی کی منزلوں کا راہی بن جاتا ہے۔

ذکر اللہ کے بارے میں قرآن کا ارشاد سنئے :۔

وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ ط (العنکبوت : ۴۵)

"اللہ کا ذکر بہت بڑی شئے ہے۔"

ذکر کیا ہے ؛ ہر وقت اپنے آپ کو اللہ اور اس کے رسول کی غلامی میں لگائے رکھنا، تصور میں اُس حاکمِ مطلق کو یاد کرنا، احکامِ الٰہی پر کاربند رہنا قرآنی تعلیمات کا پرچار کرنا یہ سبھی ذکر اللہ کی اقسام ہیں۔

حاکمیتِ خداوندی پر اگر مکمل یقین نہ ہو اور ہر فعل میں رضائے الٰہی کا جوہر شامل نہ ہو تو مقصود عبادت اور مدعائے زیست پورا نہیں ہوتا۔

فکرِ آخرت

ہمیشہ انجام پر نگاہ رکھنے والے لوگ ہی ہر میدان میں کامیابیوں سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ انسان کا انجام فنا نہیں بلکہ فنا کے بعد ایسی بقا ہے۔ جس میں دنیا میں کئے جانے والے ہر عمل کے بارے میں باز پرس ہو گی۔

نگہ دار فرصت کہ عالم دمے است
دم پیش عالم بہ از عالمے است

آخرت کی فکر کر کے اپنے اعمال و افعال کا محاسبہ کرنا بھی تقویٰ کا تقاضا قرار دیا گیا ہے۔ ارشادِ ربّ العزّت ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝ (الحشر: ۱۸)

”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور ہر شخص دیکھے کہ اُس نے کل کے لئے آگے کیا بھیجا ہے۔ اللہ سے ڈرو۔ وہ یقیناً تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔“

اِس آیہ کریمہ میں آخرت کی زندگی کو ”کل“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ گویا دنیا

کی پوری زندگی "آج" ہے۔ خوش بخت ہیں وہ لوگ جو کل کی فکر میں اپنی چند روزہ زندگی کو اعمالِ صالحہ سے مزیّن کر رہے ہیں۔

اصلاحِ معاشرہ

کون نہیں جانتا کہ انفرادی زندگی کے اثرات اجتماعی زندگی پر مرتّب ہوتے ہیں۔ تقویٰ جس کا تعلق اگرچہ مجموعی طور پر فرد ہی سے ہے لیکن اجتماعی اصلاح بھی اُسی صورت میں ممکن ہو سکتی ہے جب کہ اسلامی معاشرے سے متعلق ہر شخص متقی ہو۔

تقویٰ اگر ایک طرف انفرادی کردار کی تعمیر کرتا ہے تو دوسری طرف اجتماعی کردار کی تشکیل یعنی اصلاح معاشرہ کی راہیں بھی ہموار کرتا ہے۔ دنیا میں جتنی اخوّت اور مروّت مسلمانوں کے درمیان پائی جاتی ہے کسی اور نظام کے پیروکاروں میں نہیں پائی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے "اصلاح بین المسلمین" (مسلمانوں کی اصلاح) کو تقویٰ کا تقاضا قرار دیا ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ٥

(الحجرات : ۱۰)

"مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ پس اپنے بھائیوں میں اصلاح کرو اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔"

تقویٰ کے اِس تقاضے یعنی مسلمانوں کے باہمی تعلقات کی درستگی کی اہمیت حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اِس ارشاد سے بھی واضح ہوتی ہے کہ:۔

"حضرت نعمان ابن بشیر فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے ارشاد فرمایا کہ تو مومنوں کو باہمی رحم دلی، محبت اور ارتباط میں ایک بدن کی مثال دیکھے گا کہ جسم کا اگر ایک عضو کسی تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو سارا جسم بخار اور بے خوابی کا شکار ہو جاتا ہے۔"

اس قسم کا ایک اور مضمون حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا "مسلمان مسلمان کا بھائی ہوتا ہے۔ وہ نہ تو اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اس کو چھوڑتا ہے اور نہ ہی اُس کی تحقیر کرتا ہے۔ "تقویٰ یہیں ہے" سینے کی طرف تین مرتبہ اشارہ فرمایا۔ مزید ارشاد فرمایا "انسان کے لیے یہی شر کافی ہے کہ وہ اپنے مسلم بھائی کی تحقیر کرے۔ ہر مسلمان کی جان، مال اور عزت دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔"

اتحادِ ملت

کسی قوم کی سب سے بڑی خوش قسمتی اور سعادت یہ ہوتی ہے کہ اس کی صفوں میں مکمل اتفاق و اتحاد ہو۔ افتراق و انتشار سے اسے نفرت ہو۔

یہی وہ نعمتِ عظمیٰ ہے جس سے قومی زندگی کو بقا حاصل ہوتی ہے اور اسی کی وجہ سے ملی عزت اور وقار پائندہ و تابندہ رہتے ہیں۔ بخلاف اس کے تشتت و افتراق سے حیاتِ ملی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اور قومیں تباہی کے گڑھے میں گر جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے ایک مقام پر جہاں تقویٰ کا ذکر کیا ساتھ ہی اتحادِ باہمی کا ذکر کرتے ہوئے اس کے فوائد سے آگاہ فرمایا اور بے اتفاقی کو جہنم کا گڑھا قرار دیا۔

یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ

وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ ○ وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖٓ اِخْوَانًا ج وَكُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْھَا ط كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَكُمْ اٰیٰتِہٖ لَعَلَّكُمْ تَھْتَدُوْنَ ○ (آلِ عمران : ۱۰۱ تا ۱۰۳)

"اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے جیسے کہ اُس سے ڈرنے کا حق ہے۔ اور نہ مرو مگر مسلمان ہی ہو کر۔ اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو، اور تفرقہ نہ کرو۔ اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اُس نے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے محبّت پیدا کی اور تم اُس کے احسان سے بھائی بھائی ہو گئے۔ تم دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر کھڑے تھے۔ پس اُس نے اس سے بچایا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہاری ہدایت کے لئے اپنی آیتیں بیان فرماتا ہے۔

ہر وہ قوم جو اپنے مقصدِ حیات سے منحرف ہو کر اصولوں کو ترک کر کے جزئیات و فروعات میں الجھنے کی کوشش کرتی ہے اُس کے ہاں بگاڑ کا ہونا ناگزیر ہو جاتا ہے اور جب کوئی مِلّت تفرقہ کا شکار ہو جائے تو اس کی اصلاح و تعمیر کا ہر امکان معدوم ہو جاتا ہے۔

مسلمان کئی بار اس الہامی اصول کے نتائج و عواقب دیکھ چکے ہیں ۔

چودہ سو سال کی تاریخ میں کئی بار ایسے ہوا کہ لوگ باہمی عداوتوں کا شکار ہوئے رائے کے اختلاف سے بڑھتے بڑھتے پہلے مکتب خیال بنے پھر فرقے بنے اور پھر اللہ کی انتقامی کارروائی کے شکار ہوئے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس عرصہ میں کسی کو بندر نہیں بنایا گیا۔ آسمان سے کوئی چنگھاڑ یا چیخ نازل نہیں ہوئی، پتھروں کی بارش نہیں کی گئی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ مسلمانوں کے بارے میں یہ قانون فطرت بدل گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دائمی شفقت اور رحمت ہے جس کے زیر سایہ مسلمانوں پر اس قسم کا عذاب نازل نہیں ہو سکتا ورنہ کسی نہ کسی صورت میں ان کو بھی جھنجھوڑا گیا۔

غلبہ، استیلا، خلافت اور تمکن فی الارض کی نعمتیں ان سے چھینی گئیں۔ غلامی کے عذاب میں انہیں گرفتار کیا گیا اور آج بھی کتنے ہی مسلمان عملی طور پر یا نظریاتی اور تہذیبی لحاظ سے غلامی کی سسکیاں بھر رہے ہیں۔ کیا اس سے بڑا عذاب بھی کوئی اور ہو سکتا ہے۔ دنیا میں غلامی سے بڑھ کر بھی کوئی ذلت اور رسوائی ہو سکتی ہے۔

تفرقہ اور اختلاف کے جرم عظیم پر ذرا خالق کائنات کی ناراضگی کا اندازہ کیجئے:

وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ۝ فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝ فَذَرْهُمْ فِيْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنٍ ۝

(المومنون: ۵۲ تا ۵۴)

"یہ تمہارا دین تو ایک ہی دین ہے اور میں تمہارا رب ہوں۔ پس تقویٰ اختیار کیجئے وہ جنہوں نے دین میں مختلف طریقے بنا لیئے۔ ہر ایک اپنے ہی طریقے پر خوش ہے۔ پس (اے نبی) چھوڑیئے ان کو ایک مدت تک غفلت ہی میں پڑے رہیں"۔

مسلمانانِ عالم کی فوز و فلاح، کامیابی و کامرانی، عزت و وقار، حیات و بقا اسی میں ہے کہ وہ ایک رہیں۔ فروعی اختلافات کو ترک کر کے ایک دوسرے کی طرف رفاقت کا ہاتھ بڑھائیں۔

تقویٰ جو اسلامی کردار کا نام ہے۔ اس کا تقاضا یہی ہے کہ مسلمان حسب و نسب کے امتیاز مٹا کر وحدت کی لڑی میں پروئے جائیں۔

اور یاد رکھیئے کہ اگر مسلمانوں نے اس عظیم جُرم سے خلاصی حاصل کر لی تو ان کی عظمت و اقتدار کے ترانے ارض و سماء پر گونجیں گے۔

شعائر اللہ کی تعظیم

قرآنِ حکیم میں ارشادِ ربُّ العزّت ہے :-

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ۝ (الحج : ۳۲)

"اور جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے تو یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے"۔

شعائر میں ہر وہ چیز شامل ہے جسے اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات خود مقرر کر دے یا اس کے انبیاء مقرر کریں یا اس کی نسبت اللہ کے کسی صالح بندے سے ہو جائے۔ اس سے تبرکات بزرگانِ دین سے محبّت اور ان کے احترام کا سبق بھی ملتا ہے۔ اس لیئے کہ محبّتِ مطلق کسی شئے سے نہیں ہوتی بلکہ اس لئے

کہ اس کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ اللہ کی ذات کے ساتھ ہوتا ہے۔

مثلاً حجرِ اسود کو بوسہ دیا جاتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ پتھر ہے بلکہ اس لئے کہ اس کا تعلق اور نسبت اللہ کے ساتھ ہے اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اُسے بوسہ دیتے رہے۔

قرآن مجید میں ایک مقام پر وارد ہوا ہے:۔

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَۃَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰہِ۔

(البقرہ : ۱۵۸)

بے شک صفا اور مروہ شعائر اللہ سے ہیں۔

ان پہاڑوں کا شعائر ہونا بھی اولیاء و انبیاء سے نسبت ہی کی وجہ سے ہے۔

احترامِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

ایک آدمی تقوی کا ہر تقاضا پورا کرتا ہے لیکن احترامِ رسول کے جذبات سے اگر اس کا سینہ خالی ہے تو وہ عنداللہ ماجور نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے تمام اعمال ختم کر دیئے جاتے ہیں۔ اخروی کامیابی کا اصل راز یہ ہے کہ دل کو محبتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبات سے سرشار رکھے۔ محبت محبوب کے ہر فعل کے احیاء کے لئے قربانی چاہتی ہے۔ آج کے حالات ہم سے تقاضا کرتے ہیں کہ ہم تحریکِ مصطفوی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے رکن بن کر احکامِ الٰہی کے نفاذ کے لئے کوشش کریں۔ اور زندگی کے ہر میدان میں ضابطۂ خداوندی سے رہنمائی حاصل کریں۔

وہ لوگ جو بظاہر کلمہ گو ہیں لیکن اُن کے دل محبتِ رسولؐ اور احترامِ نبیؐ

کے جذبات سے عاری ہیں۔ ان سے بصد ادب و احترام گذارش ہے، کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ علمی ذوق پورا کرتے کرتے ایمان سے بھی ہاتھ دھونے پڑ جائیں۔

لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاتَّقُوا اللّٰہَ ط (الحجرات: ۱)

"اللہ اور اس کے رسولؐ سے آگے نہ بڑھو اور اللہ سے ڈرو"

احترام کے لئے عند الرسول اپنی آوازوں کو پست رکھنے والوں کے متعلق فرمایا:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَھُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ لِلتَّقْوٰی ط لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّ اَجْرٌ عَظِیْمٌ ہ (الحجرات: ۳)

"بلا شبہ وہ لوگ جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بات کرتے ہوئے اپنی آواز کو دھیما رکھتے ہیں۔ اصل میں وہی لوگ ہیں جن کے دل اللہ نے تقویٰ کے لئے چن لئے ہیں ایسے لوگوں کے لئے مغفرت اور اجر عظیم ہے"

معلوم یہ ہوا کہ تقویٰ کی جان اور پرہیز گاری کی روح محبت رسولؐ اور احترام نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

اس سے ایک یہ مسئلہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اپنے شیخ اور استاد کا احترام کرنا اور ان کے سامنے مودبانہ گفتگو کرنا بھی تقویٰ کا ایک تقاضا ہے۔

"اور تمہیں کسی قوم کی دشمنی عدم عدل پر نہ اکسائے۔ عدل کیجئے اور اللہ سے ڈرئیے اور یہی تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔ بلاشبہ وہ تمہارے اعمال سے خبردار ہے۔"

عدل کے لیئے اردو زبان میں لفظ "انصاف" استعمال ہوتا ہے اگرچہ معانی اور مطالب کے لحاظ سے "انصاف" میں وہ زور نہیں جو "عدل" میں ہے۔ اگر عدل کا معنیٰ "توازن" کیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ عالم رنگ و بو میں پروردگار کے تمام تر امور عدالت ہی کے ساتھ قائم ہیں یعنی عدل ہی وہ قانون ہے جو قیام ہستی کے لئے ضروری ہے۔ اس مقام پر دائرہ عدل وسیع سے وسیع تر ہو جاتا ہے۔ معاملات، مقدمات، نظام شمسی سیاروں کی حرکت موسمی تغیر و تبدل اور تخلیق انسانیت و تکوین اشیائے عالم تک ہر ایک ہی تعادل و توازن کی مختلف مثالیں ہیں۔

ظلم ہو یا سرکشی، اسراف ہو یا تبذیر، فساد ہو یا اعتدا نظام عدل سے ہٹی ہوئی یہی وہ صورتیں ہیں جن کے عاملین کو قرآن نے کبھی تو شیطان کا بھائی کہہ کر پکارا اور کبھی اس سے ملتی جلتی کوئی اور اصطلاح استعمال کی۔

قرآن نے حقیقت عدل کے رموز سے آگاہی کے لئے اکثر مقامات پر غور و فکر کی دعوت بھی دی اور توازن اور تعادل کو مقصود ٹھہرایا اور صاف صاف کہہ دیا کہ جب تم بغیر ستونوں کے اٹھائے ہوئے آسمان کو دیکھتے ہو۔ جب تم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہو کر جَو سے جَو اور گندم سے گندم ہی پیدا ہوتی ہے تو پھر روزمرہ میں عدل سے انحراف کیوں؟

اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی۔

"عدل کرو عدل ہی تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔"

انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی، مسائل سیاسی ہوں یا معاشی ہماری کامیابی کا راز اسلام کے نظام عدل ہی میں ہے اس لئے کہ یہ نہ تو حواسِ خمسہ کی تخلیق ہے اور نہ ہی وجدان کی پیداوار بلکہ منزل من اللہ ہونے کی حیثیت سے یہی وہ ضابطہ حکمت ہے جسے اپنانے سے انسانیت عروج کے زینے طے کرتی ہے۔

اگر آج ہماری عدالتوں میں اسلام جو دین فطرت ہے اس کا قانونِ عدل لاگو اور قابلِ عمل نہیں تو کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ہمارے قانون دانوں کے نزدیک وہ قانون اس قابل نہیں کہ ان کے مسائل حل کر سکے۔ اگر ایسے نہیں تو نفاذ میں اتنی تاخیر کا مطلب کیا ہے ؟

برصغیر پاک و ہند میں انگریز نے ایک گہری سازش کی کہ مسلمانوں میں کچھ آدمی ایسے تیار کئے جنہوں نے قوم و ملّت میں یہ تبلیغ شروع کر دی کہ دین صرف چند عبادات کا نام ہے حالانکہ اسلام ضابطہ کائنات ہے جو زندگی کے ہر گوشہ میں رہنمائی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

بقول شاعر :- ع

جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

وفا شعارانِ اسلام !

اگر آپ امن و سکون چاہتے ہیں، اگر آپ کی خواہش زندگی کی راحت و آرام ہے، تو اس کا ایک ہی راستہ ہے۔ اسلام کے نظام عدل کی طرف لپکیں اور اس طرح تمہاری دعوت سے اہلِ جہاں جو جہالت کی تاریکیوں میں بھٹکتے پھر رہے ہیں اور اپنی شیطانیوں اور غفلت شعاریوں سے معاشرہ کو جہنم زار بنا دیا ہے۔ اسلام کے انقلابی منشور سے آگاہی حاصل کریں۔

رسوم محض سے اجتناب

کون نہیں جانتا کہ آج ہمارے معاشرے میں محض تقلیدی بنیادوں پر بہت سی ایسی رسوم کا آغاز ہوچکا ہے جو قیام دین کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ روایتی عظمتوں کی پرستش کی جاتی ہے۔ پہلے ایک عقیدہ گھڑا جاتا ہے۔ پھر اُس کی پرستش متواتر سے اس میں شانِ تقدیس پیدا کی جاتی ہے اور بعض ایسی رسمیں ہیں جن میں سوائے ضیاعِ دولت کے اور کچھ نہیں ملتا۔ قرآن مجید ان سب باتوں کی تردید کرتا ہے بلکہ ان کے ترک کرنے کو تقویٰ کا تقاضا قرار دیتا ہے۔

عربوں کا دستور تھا کہ جب وہ احرام باندھ لیتے اور گھروں میں آنے کی ضرورت پڑتی تو دروازوں سے داخل نہ ہوتے بلکہ پچھلی دیواروں سے سوراخ کرکے داخل ہوتے۔ چونکہ یہ رسمِ محض تھی، اس لئے قرآن نے اسے ایک لایعنی حرکت قرار دیتے ہوئے اس کے ترک کرنے کو تقویٰ کا تقاضا قرار دیا ـــــــ ارشادِ ربّی ہے :-

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○

(البقرہ : ۱۸۹)

"اور یہ نیکی نہیں ہے کہ تم گھروں میں پچھلی طرف سے داخل ہو بلکہ نیکی تو تقویٰ اختیار کرنا ہی ہے گھروں میں دروازوں کی طرف آیا کرو اور اللہ سے ڈرو تاکہ فلاح پاؤ۔"

ہمارے ہاں بچّوں کی پیدائش پر، شادیوں کے رچانے میں اور ماتم کے موقع پر بعض نہیں بلکہ بے شمار ایسی رسمیں منائی جاتی ہیں جن کا تعلق اصل میں یا تو ہندوؤں سے ہے یا انگریزوں سے۔ قرآنی تعلیمات کو دیکھ کر ہمیں عبرت حاصل کرنی چاہیئے اور ان مذموم رسوم و اطوار کو غیرت مذہبی کو کام میں لاتے ہوئے صرف خود ہی ترک نہیں کرنا چاہیئے بلکہ دوسرے حضرات جن کی سرشت میں ایسی عادات داخل ہیں انہیں بھی مجبور کیا جائے کہ تقلید غیر سے باز رہیں اور شیطان کو خوش نہ کریں۔

البتہ بعض دیہاتوں میں بعض لوگوں کو دینی اصولوں کا پابند دیکھ کر نہایت مسرت محسوس ہوتی ہے اور ان کے جذبۂ دین کو داد دینا پڑتی ہے۔ فی الحقیقت اسلام ایک سادہ اور قابل عمل دین ہے۔ یہ عین فطرت کے مطابق ہے۔ اسے کسی رسم کے پیوند کی ضرورت نہیں۔ رسوم پرست لوگ خود بھی اُن سے تنگ ہیں۔ لیکن ان کے ضمیر کی آواز جب جذبۂ نمائش کی نذر ہو جاتی ہے تو وہ ہر وہ کام کرتے ہیں جو اُن کا من اجازت دیتا ہے۔

غیر اقوام کی تقلید سے بیزاری

مسلمان کسی قوم یا ملک کا نام نہیں۔ بلکہ یہ اللہ کی وہ جماعت ہے جس کا منشور نیکی کو غالب کرنا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیئے اس کا اپنا ایک پروگرام ہے۔ اس کے پاس زندگی گزارنے کے اپنے اُصول ہیں۔ ہر وہ آدمی جو اس کے اصولوں کو کسی بھی میدان میں ٹھکراتا ہے، تو اس کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ وہ اس کے پروگرام سے متفق نہیں۔ اس کو وہ اصول اچھے نہیں لگتے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیے تھے۔

تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ ان اصولوں کو نہ اپنایا جائے جو اسلام سے ٹکر کھاتے ہیں۔ ان باتوں پر کان نہ دھرے جائیں جو غیر اقوام "نظامِ مصطفیٰ" کو ختم کرنے کے لئے کرتی ہیں۔ غیر قوموں کی تقلیدی زنجیریں اپنے پاؤں میں نہ ڈالی جائیں اور غلامی سے اپنی گردنوں کو بچایا جائے۔

اگر ایک آدمی دین کو سیاسی لحاظ سے تھائیو کریسی یعنی پاپائیت کا نام بھی دے۔ مسجد کو بھولے سے بھی نہ آئے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کا مذاق بھی اڑائے اور پھر اپنے آپ کو ایک مسلمان سمجھے اور اپنی حرکات کو قابلِ نجات خیال کرے تو یہ مسئلہ ناقابلِ فہم ہے۔

نجات اگر ہے تو صرف اس میں کہ اتھارٹی صرف اللہ اور اس کے رسول کی مانی جائے۔ ہمارا قرآن جب ہر اُس معاملہ میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ جس میں ہماری بہتری ہے۔ تو پھر اس نظام کے مقابلہ میں ہمارے دل فسانے کیوں تراشتے ہیں۔ ہماری جبینیں شیطانوں کے سامنے کیوں جھکتی ہیں۔ ہمارے ہاتھ خود ہی آذری کا شیوہ کیوں اختیار کرتے ہیں۔

افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو
دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

آج بھلائی کی بھیک کے لئے ہم کشکول لئے کافروں اور منافقوں کے دروازوں پر پھرتے ہیں۔ آج ہماری اطاعت کا معیار لادین عناصر کی خوشامد بن چکا ہے۔

ارشادِ ربّ العزّت ہے :-

يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ
الْمُنٰفِقِيْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۙ

(الاحزاب : ۱)

"اے نبیؐ اللہ سے ڈرو اور نہ اطاعت کرو کافروں اور منافقوں کی تحقیق اللہ علم و حکمت والا ہے۔"

اس آیت میں جاہلیت کی رسوم پر ضرب کاری لگائی گئی ہے اور منافقین اور کفار کی اطاعت سے منع فرمایا گیا ہے۔

اللہ کرے ہم انگریز کی اطاعت سے خلاصی حاصل کرلیں ورنہ معاش ہو یا معیشت، سماج ہو یا سیاست، فوج ہو یا کوئی اور ادارہ ہمارا ہر فعل غیر اقوام کی تقلید میں ہے۔

وعدے کی پابندی

وعدے کی نوعیت نجی ہو یا کاروباری، عہد اللہ سے کیا جائے یا مخلوق سے، بہر صورت اس کی پابندی کرنا تقوی کے تقاضوں میں سے ہے۔

قرآن نے ایک جگہ یہود کے بارے میں ان کی عہد شکنی کی بدولت ہی کہا:-

اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ
عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ۝

(الانفال : ۵۶)

وہ لوگ جن سے تو نے عہد کیا، ہر مرتبہ اس کو توڑتے ہیں اور خدا سے ڈرتے نہیں۔"

سورۂ توبہ میں ایک مقام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین سے بھی وعدہ پورا کرنے کو کہا گیا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ (التوبہ : ۴)

"ان سے وعدوں کی مدّت کے مطابق پورا کرو بے شک اللہ متقین سے محبّت کرتا ہے۔"

سورۂ مائدہ میں ارشادِ ربّانی ہے:۔

"اے مومنو! اپنے بندھے ہوئے وعدوں کو پورا کرو۔"

ایک مقام پر آتا ہے:۔

اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا۔

یعنی "وعدے کے بارے میں پرسش ہوگی۔"

حضور سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ وعدے کی پابندی کی اور ساتھ ہی اپنے پیروکاروں کو ایفائے عہد کی تلقین کرتے رہے۔ آپ کی مشہور و معروف حدیث ہے کہ:۔

لَا دِيْنَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهٗ۔

"اس کا دین نہیں جس کا عہد نہیں۔"

ایک موقع پر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسلامی لشکر کے ساتھ بدر میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ قلتِ تعداد کی وجہ سے ایک ایک آدمی کی ضرورت پڑ رہی تھی۔ دو صحابی حضرت حذیفہؓ اور حضرت حسیلؓ جنہوں نے مشرکین سے عدم شرکت کا وعدہ کر لیا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور

ساری داستان سنائی تو آپ نے ان کو مدینہ بھیج دیا اور فرمایا ہم وعدے کی پابندی کریں گے۔

عہد کو پورا کرنا بھی تقویٰ کے لوازمات میں سے ہے اور متقین کا شعار ہے۔

وعدہ کرتے ہوئے اس بات کا لحاظ ضرور رکھنا چاہیئے کہ کیا جانے والا وعدہ کہیں اسلامی شریعت کی روح کے خلاف نہ ہو بلکہ زبان سے ہی ایسے الفاظ نہیں نکالنے چاہئیں۔ جن پر عمل کرنا ممکن نہ ہو۔ اسلام نے اس بات سے بھی منع کیا ہے۔ ایسی باتیں نہ کیا کرو جو تم نہیں کرسکتے۔ اس لئے کہ یہ اللہ کے ہاں بڑے غصے کی بات ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ۝ (الصف : ۲)

"اے ایمان والو! کیوں کہتے ہو، جو تم کرتے نہیں"۔

واللہ اعلم بالصواب

اصولِ تعاون

اسلام کا مقصد نیکی اور بھلائی کو برائیوں پر غالب کرنا ہے۔ اس لئے یہ اپنے ہر ماننے والے کو اس بات پر اکساتا ہے کہ نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے کا ساتھ دیا جائے۔

قرآن مجید نے اس سلسلہ میں ایک زرین اصول قائم کیا ہے:۔

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ

إِنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ٥ (المائدہ : ۲)

"نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی میں باہم ہاتھ نہ بٹاؤ۔ اللہ سے ڈرو بیشک اللہ کا عذاب بہت سخت ہے۔"

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ کسی انقلابی گروہ کی کامیابی یا ناکامیابی کا دارومدار، تعاون اور عدم تعاون پر ہی ہوتا ہے۔ اگر نیک کام میں تعاون نہ کیا جائے تو جن مقاصد کے لئے کوئی تحریک چلائی جاتی ہے۔ ان کا پورا ہونا کافی حد تک ناممکن ہوتا ہے۔ مسلمان جن کی زندگی کے منشور میں ہی یہ بات شامل ہے کہ دنیا سے فاسد نظام کو ختم کیا جائے اور نظامِ مصطفٰے ؐ کو رائج کر کے پستی ہوئی انسانیت کو نجات دلائی جائے۔ اگر ان کے کچھ افراد اُن باتوں میں مدد کرنی شروع کر دیں جن سے باطل کے اصولوں کو تقویت پہنچتی ہو تو نظامِ حق کے لئے چلائی گئی تحریک کو نقصان ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسلامی معاشرے کے ہر فرد پر یہ قید لگا دی ہے کہ مدد کے ہاتھ صرف نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں اٹھنے چاہئیں۔ اگر کوئی شخص اثم اور عدوان کو پھیلانے کی سعی میں مصروف ہوتا ہے تو اُسے یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب بہت سخت ہے۔

رائے یا ووٹ ایک مسلمان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی ایک مقدس امانت ہے۔ اس کا صحیح استعمال "تعاون علی البرّ والتّقویٰ" میں شامل ہے اور اس کا غلط استعمال "تعاون علی الاثم" کے ضمن میں آتا ہے۔

اگر کوئی شخص اپنے حق رائے کو کسی باطل نظام کی تائید میں استعمال کرتا

ہے تو وہ "اِنَّ اللّٰہَ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ o" کے زمرے میں آتا ہے۔
یاد رہے کہ اسلام کے مقابلہ میں ہر اختراعی نظام باطل ہے خواہ وہ جمہوریت ہو یا سوشلزم، کمیونزم ہو یا لادینیت۔ زندگی کے کسی شعبہ میں اسلام کسی پیوند کا محتاج نہیں بلکہ اگر کوئی شخص جمہوریت یا سوشلزم کا پیوند لگاتا ہے تو حقیقت میں وہ اپنے باطل نظریات پر اسلام کا لیبل لگا کر مسلمانوں کی آنکھوں پر ہاتھ رکھتا ہے۔ سؤر کی گردن پر اگر بسم اللہِ اللہ اکبر کہہ کر چھری پھیر دی جائے تو وہ کبھی حلال نہیں ہوتا۔

غیبت سے بچنا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ حضور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث نقل کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا:

"کیا تم جانتے ہو غیبت کیا ہے۔" لوگوں نے کہا کہ "اللہ اور رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔" آپ نے فرمایا: "تمہارا اپنے بھائی کو اس طرح یاد کرنا جو اُسے ناگوار گذرے۔" آپ سے کہا گیا کہ "اگر وہ بات اُس میں موجود ہو تو آپ نے جواب دیا۔ اگر وہ اُس میں موجود ہو تو تم نے غیبت کی۔ اگر نہیں تو تم نے بہتان باندھا۔"

حدیث مذکورہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے غیبت کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ کسی مسلمان کی غیر حاضری میں اُس کی کوئی ایسی بات کرنا جو اُسے ناگوار گذرے وہ غیبت کہلاتی ہے۔ وہ بُرائی جو بیان کی گئی ہو برابر ہے کہ اُس میں موجود ہو یا نہ ہو۔
قرآن مجید نے غیبت کی مذمت کی اور اس سے بچنے کو تقوٰی کا تقاضا

قرار دیا:-

وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ۝

(الحجرات : ۱۲)

"تم میں سے کوئی ایک دوسرے کی غیبت نہ کرے۔ کیا تم میں سے کوئی ایک یہ پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے۔ یقیناً تمہیں یہ ناپسند ہے۔ ڈرو اللہ سے۔ اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی طور پر بھی غیبت کی مذمت ایک دفعہ اسی صورت میں کی۔ جب کہ ماعز بن مالک اسلمی کو زنا کے جرم میں رجم کی سزا دی گئی، تو دو صحابیوں نے ان پر تنقید کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سُن لیا۔ کچھ دُور راستے میں آپ کی نظر ایک مردہ گدھے پر پڑی۔ آپ نے ان صحابیوں کو بلایا اور فرمایا کہ اس کو کھانا شروع کرو۔ انہوں نے جواب دیا: "اسے کون کھائے:" آپ نے ان سے کہا کہ ابھی جو تم اپنے مُردہ بھائی پر حرف زنی کر رہے تھے۔ وہ اس کے کھانے سے زیادہ بُری تھی۔

بدکاری سے اجتناب

بیماریوں کے جراثیم کو مارنا عین مصلحت ہوتا ہے۔ قومِ لوط کی اخلاقی پستی جب حد کو پہنچ گئی تو اللہ تعالیٰ نے اس کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا ہی مناسب سمجھا۔ حضرت لوط علیہ السّلام کے گھر فرشتوں کو نہایت خوبصورت لڑکوں کی

صورت میں بھیجا گیا۔ قومِ لوط خوشیاں مناتی ہوئی آئی۔ اور حضرت لوط علیہ السّلام کے گھر کو گھیر لیا۔ وہ کیا جانتے تھے کہ خوبصورتی کے روپ میں ان کی تباہی کا سامان مہیّا کیا گیا ہے۔ کتنی ہی بدنصیب قوم تھی کہ اپنی بربادی پر قہقہے لگا کر وقت کے نبی سے قیل وقال کر رہی تھی۔ خدا کی کارسازیاں بھی عجیب ہیں۔ چاہے تو یوسف علیہ السّلام کو کنوئیں میں پھینک کر، گھر سے بے گھر کرکے۔ بازار مصر میں بیچ کر زنداں کی سختیاں دے کر اس کے عروج کے زینے طے کروائے، اور چاہے تو قوم لوط کے سامنے حسن رچا کر ان سے قہقہے لگوا کر واصل جہنّم کردے۔

جب لوط علیہ السّلام کی قوم نے آپ سے مطالبہ کیا کہ وہ ان لڑکوں کو ان کے حوالے کر دیں۔ تو لوط علیہ السّلام نے بڑے مؤثر انداز میں قوم کو تقویٰ کی تلقین کی۔ فرمایا:۔

قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِىْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ۝ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ۝ (الحجر: ۶۸، ۶۹)

"لوط (علیہ السّلام) نے فرمایا۔ بے شک یہ میرے مہمان ہیں پس تم میری فضیحت نہ کرو۔ اللہ سے ڈرو اور مجھے رسوا نہ کرو۔"

جب حضرت لوط علیہ السّلام کی قوم نے اپنے نبی کی دعوت کو نہ سُنا، تو وہی لڑکے اُن کے عذاب کا باعث بنے، اور قومِ لوط کو ایک چنگھاڑ نے لے لیا۔ اس طرح عذاب الٰہی کا وعدہ پورا ہوا۔

قومِ لوط کو عذاب میں گرفتار کرنے کی وجہ یہی تھی کہ وہ بدکاری اور بدفعلی کے اڈّے جما کر فحاشی، عریانیت، زناکاری اور لواطت کا درس دیتے تھے۔ ان کے اس قومی نوعیّت کے جرم پر رب العزّت نے انہیں زمین میں دھنسا دیا۔

ہلاکتِ قومِ لوط سے ہمیں عبرت حاصل کرنی چاہیئے اور بدکاری اور اس کے مقدمات سے مکمل اجتناب برتنا چاہیئے۔

اساسِ عمل

اعمال اور مختلف افعال کا حسن انسان کے باطنی ارادے اور حسنِ نیّت کا مرہونِ منّت ہوتا ہے۔ بظاہر کوئی کام کتنا ہی حسین اور دل کش کیوں نہ ہو، جب تک ارادہ اور نیّت صحیح اور درست نہ ہو وہ کام نامقبول ہوگا۔ اس اعتبار سے تمام نیکیوں اور سارے امور کی بنیاد چونکہ حسنِ نیّت اور خلوص پر ہے۔ اس لئے قرآنِ حکیم اسے "تقویٰ" قرار دے کر سارے اعمال کی اساس قرار دیتا ہے اور ہر وہ کام جس کی بنیاد "تقویٰ" پر نہ ہو اسے قابلِ مذمت سمجھتا ہے۔ ان امور کو مضبوط اور مستحکم کرنے کا حکم صادر فرماتا ہے۔ "جس کی بنیاد تقویٰ پر ہو"۔

ہمارے اس مؤقف کو مسجدِ ضرار کا واقعہ قوت دیتا ہے۔ ارشادِ ربّ ذوالجلال ہے:۔

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ۔ (التوبہ : ۱۰۹)

"کیا وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی بنیاد تقویٰ اور اللہ کی رضا پر رکھی وہ اچھا ہے یا وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی بنیاد گر جانے والی کھائی کے کنارے رکھی"۔

اور اس مسجد کو عبادت کے لئے حقدار قرار دیا جس کی بنیاد تقویٰ پر ہو۔

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ
اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ط ۔ (التوبہ : ۱۰۸)

"وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے ہی دن سے تقویٰ پر رکھی گئی وہی مستحق ہے کہ آپ اس میں جائیں"۔ اسی طرح سارے امور کی جان اللہ تعالیٰ نے تقویٰ قرار دیا۔ سفر زادِ راہ کا مسئلہ ہو تو ارشادِ باری تعالیٰ ہے :۔

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۔

(سفر میں) زادِ راہ لو اور سب سے اچھا توشہ "تقویٰ" ہے۔

جسم کی زیب و زینت کی بات ہو تو پھر "تقویٰ" ہی ملحوظِ نظر و عمل رکھنے کی تلقین فرمائی۔

وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ ۔ (الاعراف ۲۶)

اور تقویٰ ہی کا لباس سب سے بہتر ہے۔

عفو و درگزر

خداوند کریم نے عفو و درگزر کو "تقویٰ" کے نہایت ہی قریب قرار دیا۔

وَاَنْ تَعْفُوْا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۔ (بقرہ : ۲۳۷)

اگر تم معاف کر دو تو یہ "تقویٰ" سے قریب تر ہے۔

ایک اور آیت میں قصور کرنے والوں کو معاف کر دینے کا اشارہ اس طرح فرمایا :۔

وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ط اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ
اللّٰهُ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

(النور : ۲۲)

"چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگذر کریں ۔ کیا تم یہ پسند نہیں
کرتے کہ خدا تم کو معاف کر دے ۔ اور اللہ تعالیٰ معاف کرنے
والا اور مہربان ہے"۔

غصہ اور غضب کے وقت ضبط وسکون کے حاملین اور معاف کر دینے
والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :-

وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ ۝ (شوریٰ : ۳۷)

"اور جس وقت غصہ آئے تو وہ معاف کرتے ہیں"۔

وہ لوگ جو عفو و درگزر کو اپنا شعار بناتے ہیں اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران
آیت ۱۳۴ میں ان کی مغفرت اور ان کے لئے وسیع جنت کا وعدہ فرمایا ہے ۔
سورۂ شوریٰ میں صبر اور معاف کر دینے کی صفت کو بڑی اہمیت کی
بات قرار دیا گیا ۔

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ
(شوریٰ : ۴۳)

"جس نے صبر کیا اور معاف کیا تو یہ بڑی ہمت کی بات ہے"۔

عفو و درگزر کی فضیلت میں ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
ارشاد فرمایا :-

وما زاد اللہ رجلاً بعفوٍ الا عزّا ۔

"درگزر کرنے والے کی اللہ تعالیٰ عزت بڑھا دیتا ہے"۔

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں محسنین کی جن صفات کے ساتھ تعریف کی ان
میں معاف اور درگزر کرنے کی صفت کو بھی گنا ۔

وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ط

وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ (آلِ عمران: ۱۳۴)

"غصّے کو پی جانے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے، اور اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔"

ترمذی شریف کی حدیث ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر کہا: "یارسولؐ اللہ! میں اپنے خادم کا قصور کتنا معاف کروں۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "ہر روز ستر بار۔"

حضرت ابو سعود صحابیؓ کا بیان ہے، وہ فرماتے ہیں کہ "ایک دفعہ میں اپنے غلام کو پیٹ رہا تھا، پیچھے سے آواز آئی "جان لو، جان لو۔" دیکھا تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرما رہے تھے: "ابو سعود! جتنا تم خادم پر قابو رکھتے ہو اس سے زیادہ خدا تم پر قابو رکھتا ہے۔" ابو سعود فرماتے ہیں کہ اس بات کا مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ پھر میں نے کسی غلام کو نہ مارا۔"

سچائی

قرآنِ حکیم نے صدق اور سچائی کو بھی متّقی کی صفات میں گنا۔

وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِہٖ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ (الزمر: ۳۳)

"جو سچ لے کر آیا اور اس کو سچّا بھی جانا سو وہی پرہیزگار ہے۔"

صدق اور سچائی کو جہاں خدائی صفت ہونے کا شرف حاصل ہے وہاں انسانی اخلاق کے میدان میں بھی اسے سب سے اعلیٰ اور اونچا مقام حاصل ہے۔ صدق چونکہ دل اور زبان کی ہم آہنگی کا نام ہے۔ اس لئے اگر سچائی اور صداقت

حاصل ہو جائے تو نیکیوں کا حصول آسان ہو جاتا ہے۔

اعمال اور اخلاق کی بنیاد سچائی ہے۔ اسی لیے اسلام نے صرف "صدق" کے اختیار کرنے کا حکم ہی نہیں دیا بلکہ ہمیشہ سچوں کے ساتھ رہنے کا مسلمانوں کو پابند بناتے ہوئے اس کو تقویٰ کا ایک تقاضا قرار دیا ہے۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (التوبہ : ۱۱۹)

"اے اہلِ ایمان تقویٰ اختیار کرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔"

قیامت کے دن بھی صدق ہی کام آئے گا۔

هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ۝

(المائدہ : ۱۱۹)

"یہ ایسا دن ہے کہ سچوں کو ان کا سچ ہی کام دے گا۔"

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں "صدق" کی چھ اقسام بیان کی ہیں۔

۱۔ زبان کی سچائی
۲۔ نیّت کی سچائی
۳۔ عزم کی سچائی
۴۔ عزم کو تکمیل تک پہنچانے کی سچائی
۵۔ عمل میں سچائی
۶۔ امورِ دینیہ میں سچائی

صدق کی برکت کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ روایت ملاحظہ ہو جس میں ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی تھی کہ مجھ میں چار بُری خصلتیں ہیں، یارسول اللہ! ایک کو چھوڑ دینے کی تلقین فرمائیں۔ تو آپ

نے فرمایا تھا "جھوٹ بولنا چھوڑ دو" تو اللہ تعالیٰ نے ترک جھوٹ اور سچائی اختیار کرنے کی وجہ سے اسے ساری بُری خصلتوں سے محفوظ کر دیا۔
اللہ تعالیٰ سچ اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

احسان

تقویٰ کا تعلق چونکہ شخصی اور اجتماعی حسن اور جمال کے ساتھ ہے۔ ظاہری اور باطنی ہر قسم کی خوبیاں تقویٰ میں داخل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم ان تمام اوصاف شخصی و اجتماعی اور افعالِ خیر کے لئے ایک جامع اصطلاح "احسان" استعمال کر کے اسے تقویٰ کا تقاضا قرار دیتا ہے۔

وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ۝ (النساء : ۱۲۸)

"اگر تم نیکی کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے خبردار ہے۔"

ہر قسم کی نیکی خواہ وہ بصورتِ فعل و عمل ہو یا تصوّر و عقیدہ احسان کے مفہوم میں داخل ہے لیکن قرآنِ حکیم میں شکر، مصیبت سے نجات دلانا، حقوق کی ادائیگی، صدقات اور قرضِ حسنہ وغیرہ کو احسان قرار دیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رحم و کرم، مہمان نوازی، تنگ دست کو مہلت، گردنوں کے چھڑانے، صلہ رحمی، اچھی گفتگو، ضعیف کی مدد، بھوکے کو کھلانا، پیاسے کو پانی پلانا اور ایذا رسانی سے اجتناب کرنے کو "احسان" قرار دیا۔

اللہ تعالیٰ نے محسن کے بارے میں ارشاد فرمایا۔

وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ (آلِ عمران : ۱۳۴)

"اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے"۔

ایک مرتبہ حضرت جبرائیل امین نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا۔

اخبرنی عن الاحسان۔

"یارسول اللہ! احسان کے بارے میں ہمیں خبردار کیجئے"۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ

فانہ یراک۔ (مشکوٰۃ : کتاب الایمان)

"تو اللہ کی عبادت ایسے کرے جیسے کہ تو اُسے دیکھ رہا ہے، یا اگر تو اسے نہیں بھی دیکھ رہا تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے"۔

یہاں پر محدثین نے احسان سے مراد "اخلاص" لیا، چونکہ تصوف کی حقیقت بھی یہی "اخلاص" ہے جو بدرجہ اتم سالک کو حاصل ہو جاتی ہے۔ اس اعتبار سے بعض متصوفین نے تصوّف کا ماخذ احسان قرار دیا۔ حدیث شریف میں احسان کے مفہوم کو اسلام اور ایمان سے الگ قرار دیا گیا۔ جس کو اگر اسلام سے علیحدہ قرار نہ بھی دیا جا سکتا ہو، تاہم پھر بھی کم از کم مسلمان کی عرفانی زندگی پر ضرور دلالت ہے۔

صبر

سفینۂ حیات کو موت کے ساحل تک پہنچنے کے لئے متعدد آبناؤں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کبھی تو حسین تمنائیں اور فرحت بخش امیدیں اس کا استقبال کرتی ہیں اور کبھی غم و آلام اور کرب و مصائب کے وجود پاش تھپیڑے اس کو اپنے نرغے میں لے لیتے ہیں۔ حالات کے بیکراں سمندر میں کبھی تو طرب و

نشاط کی موجیں اُسے بلندیوں پر اٹھا لیتی ہیں اور کبھی پریشانی اور اضطراب کے وحشت ناک بھنور میں جا پھینکتی ہیں۔

حالات کی نوعا نوعی اور ہیجان انگیز انقلابات کے تنوع و اختلافات پر کیا کسی شخص کو دل پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا چاہیئے۔ کیا مصائب پر آہ و فغاں اور ماتم و نوحہ کے علاوہ بھی کوئی راستہ ہے۔

ہاں وہ لوگ جنہیں قرطاسِ حیات پر واضح نقوش ثبت کرنے ہوں۔ ان کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ ہر وقت مقاصدِ زندگی کی تکمیل کی خاطر جان کاوی، دیدہ ریزی اور محنت و مشقت کے ساتھ ساتھ نتائج کے انتظار میں صبر و ثبات اور استقامت و استقلال کا دامن تھامے رکھیں۔

تقویٰ جو مسلمان کے اس کردار کا نام ہے جس سے اس کی شخصیّت میں حسن، توازن، سنجیدگی، متانت اور وقار پیدا ہوتا ہے۔ مصائب و آلام کے وقت صبر اور مصابرہ بھی اس کا ایک تقاضا ہے۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا قف وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

(آلِ عمران : ۲۰۰)

"اے ایمان والو! صبر کرو اور ثابت قدم رہو، خدمت حق کے لئے آمادہ رہو اور تقویٰ اختیار کرو تاکہ تمہاری فلاح ہو۔"

صبر کا معنیٰ کیا ہے؟ علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں۔

تنگی اور شدّت کے وقت روکنے کو صبر کہتے ہیں۔

عرب کہتے ہیں "صبرتُ الدّابۃ" میں نے بغیر چارہ کے جانور کو

روک لیا۔ جانشین بنا لینے کے معنوں میں بھی یہ کلمہ استعمال ہوتا ہے۔ اصطلاحاً نیک اعمال کرنے اور بُرے اعمال سے باز رہنے پر نفس کو پابند رکھنا صبر کہلاتا ہے۔
مصابرہ کا مفہوم صبر سے تھوڑا مختلف واقع ہوا ہے۔ عام طور پر اس کا مطلب دشمن کے مقابلہ میں پامردی دکھانا لیا جاتا ہے۔ باطل کے خلاف ایک دوسرے سے بڑھ کر کمر بستگی کا مظاہرہ کرنا بھی مصابرہ کے مفہوم میں داخل ہو سکتا ہے۔

تیاری جہاد

مسلمان خالقِ کائنات کی طرف سے وہ انقلابی جماعت ہے جو ہر دم خدمتِ انسانیت کے لئے کمر بستہ رہتی ہے۔ جہاں بھی اور جس وقت بھی کوئی ابلیسی اور سرکش قوت "فساد" کے لئے اپنا دام ہمرنگ زمین بچھاتی ہے۔ ان کی خدائی صفوں میں حرکت آجاتی ہے۔ ایک ایک مسلمان لذتِ حیات سے بے آشنا ہو کر موت سے پیار کرنے لگ جاتا ہے۔
ظاہر ہے باطل اور طاغوت کو درسِ عبرت دینے کے لئے طاقت اور قوت کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم جہاں مسلمانوں کو فلاحِ انسانیت کے لئے دیگر صلاحیتیں بروئے کار لانے کا پابند کرتا ہے، وہاں "اعدوا لھم ما استطعتم" کے تحت دشمن کے مقابلہ میں ہر طرح کی مادی تیاری کا بھی حکم دیتا ہے۔
"تقویٰ" جو کردارِ مومن کا دوسرا نام ہے۔ اپنے حامل میں یہ فکر اور سوچ بھی اجاگر کرتا ہے کہ غلبۂ اسلام کے لئے مسلمان کو ہر دم دشمن کے مقابلہ میں تیار اور کمر بستہ رہنا چاہیئے۔"

ارشادِ ربّ ذوالجلال ہے۔

وَرَابِطُوْا قف وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ہ

(آلِ عمران : ۲۰۰)

"خدمت حق کے لئے آمادہ اور تیار رہو اور تقویٰ اختیار کرو تاکہ تمہاری فلاح ہو۔"

ربط اور رباط کا لغوی معنیٰ تو گھوڑے کو حفاظت کے لئے کسی جگہ مضبوطی سے باندھ دینا ہوتا ہے اور اس سے "رباط الجیش" کا لفظ استعمال ہوتا ہے اصلاحی طور پر اپنے آپ کو غلبۂ دین کے لئے آمادہ، عبادت کا پابند اور دشمن کے مقابلے میں کمربستہ رہنے کو رباط کہتے ہیں۔

صاحب مفردات نے "رباط" کے مفہوم کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک قول نقل کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے لئے تیار رہنا بھی "رباط" ہے۔

"رباط" کا اعلیٰ مقام اور مرتبہ یہی ہے کہ انسان "جہاد فی سبیل اللہ" کے لئے ہر وقت تیار رہے۔

حرمتِ سُود

معاشی بدحالی معاشرتی بیماریاں پیدا کرتی ہے۔ غربت اور افلاس، صبر اور استقامت کی دولت کے بغیر اخلاقی بیماریوں کی بنیاد بن جاتے ہیں۔ اخلاقی اقدار کے مٹ جانے کی وجہ سے تعمیر و ترقی کے میدان میں جمود طاری ہو جاتا ہے۔ اسلام ایک مکمل معاشی نظام کی حیثیت سے ایسی تمام بنیادی کمزوریوں کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے۔ جن سے جسد ملت کی صحت بگڑ جانے کا اندیشہ ہو۔

سود جس کے لیے عربی زبان میں لفظ "ربا" استعمال ہوتا ہے۔ اسلام کی نظر میں ایسی مذموم حرکت اور قبیح بیماری ہے جس کا ارتکاب کرنے والوں کے حق میں قرآنِ حکیم کی یہ وعید ہے۔

وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْٓ اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ۔ (آلِ عمران : ۱۳۱)

"اُس آگ سے ڈرو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے"۔

امام ابوحنیفہؒ[1] اس آیت کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ قرآن مجید کی سب سے زیادہ ڈرانے والی آیت یہی ہے۔ اس لیے کہ اس آیت میں آگ کی وعید ان لوگوں کے لیے جو کافر تو نہیں لیکن اللہ کی حرام ٹھہرائی ہوئی چیزیں حلال جانتے ہیں۔

احکامِ الٰہی سے بے رغبتی اور بے اعتنائی برتنا چونکہ "تقویٰ" کے منافی ہے اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ شیدائیانِ اسلام کے لیے یہ ضروری قرار دیتا ہے کہ وہ سود جیسی قبیح حرکت سے بچیں۔ فرمانِ خداوندی ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَۃً وَّاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ۔

(آلِ عمران : ۱۳۰)

"اے ایمان والو! سود بڑھا بڑھا کر نہ کھاؤ، اللہ سے ڈرو تاکہ تمہاری فلاح ہو"۔

نوٹ علمائے کرام نے آیت کا ترجمہ مختلف طریقوں سے کیا ہے۔ ترجمہ دوگنا سے کیا جائے یا "خوب بڑھانے" سے کیا جائے بہر صورت ہر قسم کے سود کی حرمت ثابت ہو جاتی ہے۔

[1] تفسیر مدارک

دُعَاء

اے پروردگار! میں دل کی گہرائیوں سے تیرا شکر ادا کرتا ہوں کہ تُو نے مجھے توفیق بخشی کہ "تقویٰ" کے موضوع پر کچھ لکھنے کے قابل ہوا۔ میں اس امید کے ساتھ دامنِ قرطاس کو سمیٹتا ہوں کہ تُو پھر بھی اسے چمنستانِ دین سے گل چیننے کی توفیق عطا فرماتا رہے گا۔

الٰہ العالمین! تو چاہے تو ریت سے ستون کا کام لے لے اور چاہے تو جاہل کو فیض علم کا سرچشمہ بنا دے۔ دنیا کا نظام تیری نگاہ عنایت ہی سے چل رہا ہے۔

اے میرے اللہ! زمین پر بسنے والی انسانیت تیرے مقصودی نظام سے دُور ہو رہی ہے۔ اسے قرآن کے قریب کر دے۔

(آمین یا ربنا الکریم)